

## غدير اور مسلمانوں کو اندر سے درپیش خطرہ

<?xml encoding="UTF-8">

\* یہ تقریر عیدِ غدیر کی رات ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۶۸ء مرکز تعلیمِ دین و دانش نجف باد کی مسجدِ چہار سوق میں کی گئی۔

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

”الْيَوْمَ يَبْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنَ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا.“ (سورہ مائدہ ۵۔یت ۳)

سب سے پہلے میں پ بھائیوں اور مولائے متقیان علی علیہ السلام کے تمام شیعوں کو اس عیدِ سعید پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ میں ایک ایسی محفل میں شریک ہوں جو نوجوانوں اور طلباء کے ایک گروہ کی طرف سے منعقد کی گئی ہے۔ درحقیقت جو بات سب سے زیادہ باعثِ خوشی و مسرت ہے وہ عام مسلمانوں اور خصوصاً نوجوان طبقے میں ایک دینی و مذہبی تحریک کی علامتوں کا دکھائی دینا ہے، اپنے ملک میں اس کے ہم خود شاہد و ناظر ہیں۔ وہ بھی طلباء کے جوان طبقے میں جن کے اذہان علمی مفاہیم سے سنا ہیں۔ اولاً ہر ملک کے جوانوں کے رجحانات دیکھ کر اس ملک کے مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ جوانوں کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے، خصوصاً تعلیم یافتہ جوان اور طلباء۔

اگرچہ ایک طرف بعض ناپاک عناصر اپنی سرگرمیوں کے ذریعے اس بات کے لئے کوشاں ہیں کہ ہر ممکن طریقے سے نوجوان طبقے کو برائی کی طرف کھینچ لے جائیں، اور دوسری طرف ایسی سرگرمیاں جاری ہیں جن کا مقصد دین و مذہب اور علم و دانش کے درمیان مصنوعی تضاد ایجاد کرنا ہے۔ جوانوں میں پیدا ہونے والی تحریک کا یہ ہراول دستہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مضر اور خطرناک کوششیں بحمدلہ ناکام ہو رہی ہیں۔

یہ مقدس شب، جو عیدِ سعیدِ غدیر کی رات ہے اور مولائے متقیان علیؑ سے نسبت رکھتی ہے، اس میں بہت سے موضوعات پر بحث و گفتگو کی گنجائش اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ خود علیؑ ایک وسیع اور جامع موضوع ہیں۔ خاص طور پر غدیر اور خلافت، امامت اور ولایت پر حضرت علیؑ کے نصب کئے جانے کا موضوع بھی اپنے مقام پر بہت وسیع ہے۔ اس پر مختلف حوالوں سے بات کی جاسکتی ہے۔ جیسے کہ غدیر کے موقع پر

پیغمبر اکرمؐ کے فرمان: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ (جس کا میں مولا ہوں، پس یہ علی بھی اس کے مولا ہیں) سے اس سے پہلے اور بعد کی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اس سے پہلے (نحضرۃ نے) یہ فرمایا تھا کہ: اَلَسْتُ اَوَّلِيْ بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ؟ (کیا میں خود تم پر تم سے اولویت (اور زیادہ حق) نہیں رکھتا؟) کیا

میں تم پر حق ولایت نہیں رکھتا؟ نحضرۃ نے قرن کی اس یتِ کریمہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: اَلَنْبِيُّ اَوَّلِيٌّ بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (نبی تمام مومنین پر ان سے بڑھ کر حق رکھتا ہے۔ سورہ احزاب۔ یت ۶) سب پکارے۔۔ بلی بلی (ہاں ہاں ایسا ہی ہے)۔ پھر پ نے فرمایا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهَذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ اور اس کے بعد فرمایا کہ: اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَاٰلِهٖ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ (یا اللہ اس سے محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے اور اسے دشمن رکھ جو اس سے دشمنی رکھے)

وہ تمام نصوص جو اس حوالے سے قرنِ مجید میموجود ہیں، یا پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں

فرمائی ہیں، بطور کلی مولائے متقیان کا لائق ترین ہونا اور پ کے دیگر فضائل، یہ وہ مسائل ہیں جن پر چ شب کی مناسبت سے بات کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اپنی معروضات کو اس موضوع سے مخصوص کروں جو عملی حوالے سے ہمارے لئے زیادہ سود مند، مفید تر اور زیادہ سبق موز ہے اور اسکے ساتھ ساتھ غدیر کے مباحث اور فصول میں سے بھی ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ: حضرت علیؑ کی خلافت کے بارے میں فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوا؟ واقعہ غدیر اور رسول اکرمؐ کی وفات کے درمیان تقریباً ڈھائی ماہ کا فاصلہ تھا۔ خر کس طرح مسلمانوں نے (اتنی جلدی) رسول اکرمؐ کی وصیت نظر انداز کردی؟

### پہلا نظریہ

یہ کہا جائے کہ تمام مسلمانوں نے اپنے قومی اور عربی تعصب کی وجہ سے اسلام اور رسول اللہ سے یکسر منہ موڑ لیا تھا اور باغی ہو گئے تھے۔ جب انہیں اس مسئلے کا سامنا ہوا تو وہ ایک دم اسلام سے روگرداں ہو گئے۔ یہ ایک طرح کی توجیہ و تفسیر ہے۔ لیکن بعد کے واقعات اس بات کی نشاندہی نہیں کرتے کہ مسلمان اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے مکمل طور پر روگرداں ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں وہ اپنی گزشتہ جاہلیت کی حالت اور بت پرستی کی طرف لوٹ گئے تھے۔

### دوسرا نظریہ

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ ہم کہیں کہ مسلمان اسلام سے روگرداں ہونا نہیں چاہتے تھے لیکن رسول اللہ کے اس ایک حکم کے بارے میں انہوں نے نافرمانی کا رویہ اختیار کیا۔ بعض وجوہات اور خاص پہلوؤں کے پیش نظر اس ایک حکم کو برداشت کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ مثلاً کیونکہ حضرت علیؑ نے (اسلام کی خاطر لڑی گئی جنگوں میں) ان کے آبائ کو قتل کیا تھا اس لئے اُن کے اندر حضرت علیؑ کے بارے میں کینہ موجود تھا یا بعض اہل سنت کے بقول وہ اس وقت یہ نہیں چاہتے تھے کہ نبوت و خلافت ایک ہی خاندان میں ہو یا پھر یہ کہ حضرت علیؑ کا عدم تساہل، سخت گیری، دو ٹوک رویہ اور غیر لچکدار ہونا بھی اپنے مقام پر ایک وجہ تھی۔ معاصر علمائے اہل سنت میسے بعض نے اسے بھی ایک سبب قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ مسلمانوں کے درمیان سختی، شدت اور غیر لچکدار ہونے کے حوالے سے معروف تھے اُن کی اس صفت کی وجہ سے مسلمانوں کی نظریں علیؑ کی طرف نہ اٹھیں (البتہ وہ یہ نہیں کہتے کہ مسلمانوں نے نصِ رسولؐ کو نظر انداز کر دیا تھا)۔ مسلمان کہتے تھے کہ اگر علیؑ برسرِ اقتدار گئے تو کسی کا لحاظ نہیں کریں گے کیونکہ علیؑ کی سابقہ زندگی سے یہی واضح ہوتا تھا۔

حکمِ الہی کے نفاذ میں حضرت علیؑ کے غیر لچکدار طرزِ عمل کی ایک مثال حجة الوداع ہی کے موقع پر واقعہ غدیر سے چند روز قبل پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو یمن روانگی کا حکم دیا تاکہ یمن کے نومسلموں کو اسلام کی تعلیمات پہنچائی جائیں۔ یمن سے حضرت علیؑ مکہ لوٹ کر آئے اور ادھر رسول اکرمؐ بھی مدینہ سے مکہ تشریف لائے۔ مکہ میں وہ ایک دوسرے سے ملے۔ حضرت علیؑ اپنی فوج کے ساتھ رہے تھے۔ فوج کے ہمراہ یمن کی کچھ نئی قبائیں تھیں۔ حضرت علیؑ یہ قبائیں رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لارہے تھے۔ البتہ وہ بعد ازاں تقسیم ہوجاتیں اور پہلے درجے میں انہی سپاہیوں کو

ملتیں۔

واپسی پر حضرت علیؑ مکہ سے ابھی چند منزل کے فاصلے پر تھے کہ خود گے روانہ ہو کر رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں پہنچ گئے، تاکہ اپنے کام کی رپورٹ پیش کرسکیں۔ انہیں پھر واپس کر فوج کے ہمراہ پہنچنا تھا۔ اس دوران میں جبکہ حضرت علیؑ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں تھے فوجیوں نے خود سے یہ سوچ لیا کہ اب جبکہ ہم مکہ میں داخل ہو رہے ہیں، ہمارے لباس گندے اور پرانے ہیں، کیوں نہ ہم یہ نئی قبائیں نکال کر پہن لیں اور نئے لباس کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں، خر کار یہ ہم ہی کو تو ملنی ہیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب حضرت علیؑ لوٹ کر آئے تو انہوں نے بیت المال میں ہونے والے اس تصرف پر اعتراض کیا اور اسے خلافِ قانون قرار دیا۔

جب فوج مکہ پہنچی تو رسولِ اکرمؐ نے ان سے سوال کیا کہ علیؑ تمہارے لئے کیسے امیر اور سپہ سالار رہے؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! علیؑ کی ہر بات اچھی ہے، لیکن کچھ سخت گیر ہیں۔ رسولِ اکرمؐ نے علیؑ پر اعتراض کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا: علیؑ کے بارے میں ایسی بات مت کرو **اِنَّهٗ لَاخَشَنُ (يَااَلْخَيْشَنُ)** فی ذات اللہ، جس مقام پر حق کا مسئلہ درپیش ہو یا حکمِ خدا کا معاملہ ہو، وہاں علیؑ ایک ایسے وجود میں تبدیل ہوجاتے ہیں جس میں کوئی نرمی نہ ہو۔ وہی شخص جو سرتاپا نرمی ہے، اپنی نرمی کو حکمِ الہی میں ہرگز دخل انداز نہیں ہونے دیتا۔

بہر حال یہ بھی ایک پہلو ہے، جسے بعض نے بیان کیا ہے۔ لیکن صرف اسکے ذریعے اتنے بڑے واقعے کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ تمام مسلمان ایک دم مرتد ہوگئے اور اسلام سے پھر گئے؟ اس ایک مسئلے میں تمام مسلمانوں نے نافرمانی کی، یہ بات بہت زیادہ بعید نہیں ہے، لیکن کیا سب مسلمانوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ پھر گئے، یا پھر کوئی اور معاملہ بھی ہے اور وہ یہ ہے:

### صحیح نظریہ:

مسلمان فریب کھاگئے اس مسئلے میں مسلمان فریب کھاگئے۔ یعنی ایک گروہ نافرمان ہوگیا۔ اس زیرک و نافرمان گروہ نے عامۃ المسلمین کو اس مسئلے میں فریب دیا۔ میں نے شروع میابیک یت کی تلاوت کی ہے۔ اس یت سے ہم اپنی گفتگو کا آغاز کرسکتے ہیں اور اسی یت سے ہم نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں۔ یہ وہی یت ہے جو امیر المومنین حضرت علیؑ کے نصب کئے جانے کے بارے میں، یعنی خلافت کے لئے پ کے تقرر کے بعد نازل ہوئی۔ یہ یت ہے: **اَلْيَوْمَ يَنْسُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ** (ج کے دن کفار تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں) یعنی ج سے کفار اس بات سے ناامید ہوگئے ہیں کہ وہ کفر کے راستے سے، دائرہ اسلام کے باہر سے اسلام پر حملہ کر سکیں گے۔ اب وہ مایوس ہو گئے ہیں کہ اس راہ سے کوئی نتیجہ حاصل کر سکیں گے۔ اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ اسلام کو باہر سے نقصان نہیں پہنچایا جاسکتا۔ **فَلَا اَ تَخْشَوْهُمْ** اے مسلمانو! اب کفار سے خوف نہ کھانا اور پریشان نہ ہونا۔

یہاں تک دو جملے ہیں۔ پہلے جملے میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے، اور دوسرے جملے میں تسلی دی گئی ہے۔ پہلے جملے میں کہاگیا ہے کہ اب وہ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ ناامید ہوگئے ہیں۔ اب اسکے بعد وہ تگ و دو نہیں کریں گے۔ دوسرے جملے میں تسلی دی گئی ہے کہ اب تم ان کی طرف سے بے فکر رہو۔ بعد کا جملہ بہت عجیب ہے۔ **وَ اَخْشَوْنَ**، اپنے دین کے بارے میں ان کی طرف سے فکرمند نہ ہونا، البتہ مجھ سے ڈرنا۔ مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے فکرمند ہونا۔

خدا کی طرف سے فکرمند ہونے سے کیا مراد ہے؟ خدا کی طرف سے تو پر امید ہونا چاہئے۔ پھر قرن کیوں کہتا ہے کہ خدا کی طرف سے فکرمند رہو۔ نکتہ اور جانِ کلام اسی مقام پر ہے۔

ہمارے دوبارہ پھر اسی نکتے پر پلٹ کر نے تک اس بات کو ذہن میں رکھئے گا۔

(پہلا جملہ) ”الْيَوْمَ يَبْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ“

(دوسرا جملہ) ”فَلَا تَخْشَوْهُمْ“

”الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا“

ج میں نے تمہارا دین سرحدِ کمال تک پہنچا دیا۔ وہ چیز جو اس دین کا کمال ہے، میں نے ج تمہیں وہ عطا کردی ہے۔ وہ چیز جس کے ذریعے میں نے اپنی نعمت کو پورا کیا ہے، اسے ج میں نے پورا کر دیا ہے۔ ج میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو ایک دین کے طور پر پسند کر لیا ہے۔ یا وہ اسلام جو ہمارے پیشِ نظر کامل اور مکمل اسلام تھا، وہ یہ ہے جو ج ہم نے تمہیں عنایت کیا ہے۔

یہاں پر ہمارے سامنے دو تعبیریں ہیں: اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اور اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي۔ تمہارے دین کو میں نے

حدِ کمال تک پہنچا دیا ہے اور اپنی نعمت کا (جو یہی دین کی نعمت ہے) اتمام کر دیا ہے۔

اتمام اور اکمال کے درمیان فرق ”اتمام“ اس مقام پر کہا جاتا ہے جب کوئی بنائی جانے والی چیز ابھی ناقص ہو، یعنی اس کے بعض اجزا ابھی نامکمل ہوں۔ مثال کے طور پر اگر ایک عمارت تعمیر کریں، تو جن کاموں کے بعد عمارت قابلِ استعمال ہوتی ہے وہ تمام کام ختم ہونے سے پہلے، مثلاً ابھی اسکی چھت باقی ہو، یا ابھی اسکے دروازے نہ لگائے گئے ہوں، تو ایسی عمارت کو ’نامکمل‘ کہتے ہیں۔ لیکن ’اکمال‘ ایک دوسری چیز ہے۔ ممکن ہے ایک چیز کا پیکر اور جسم تیار اور مکمل ہو لیکن اس لحاظ سے کہ وہ روح نہیں رکھتی اور جس حقیقت اور ثار کے مرتب ہونے کی اس سے توقع ہے وہ مرتب نہ ہوئے ہوں، تو کہتے ہیں کہ (یہ چیز) کامل نہیں۔ مثلاً اگر کہتے ہیں کہ علم کا کمال اس پر عمل ہے، تو اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک عمل نہ ہو علم کا کوئی حصہ ناقص ہے، نہیں علم علم ہے، علم علم ہی کے ذریعے مکمل ہوتا ہے لیکن علم عمل کے ذریعے کامل ہوتا ہے۔ یعنی علم کے جو ثار حاصل کئے جانے چاہئیں وہ عمل سے ہی حاصل ہوں گے۔

”إِنَّ كَمَالَ الْعِلْمِ بِالْعَمَلِ وَ كَمَالَ الْعَمَلِ بِالنِّيَّةِ وَ كَمَالَ النِّيَّةِ بِالْإِخْلَاصِ“

”کمالِ علم عمل سے ہے، کمالِ عمل نیت سے ہے اور کمالِ نیت اخلاص سے ہے۔“

نیت عمل کا جز نہیں لیکن اگر عمل کے ہمراہ کوئی نیت نہ ہو تو ایسا عمل بے اثر ہوگا۔ اخلاص بھی نیت کا جز نہیں لیکن اگر اخلاص نہ ہو تو نیت بے اثر ہوگی۔ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ أَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي، یہ حکم (یعنی حضرت علی علیہ السلام کا امامت کے لئے نصب کیا جانا) کیونکہ دین کے اجزا میں سے ایک جز اور احکامِ دین میں سے ایک حکم ہے، پس (اب تک) نعمتِ ناتمام تھی، اب تمام ہوگئی۔ پھر اس اعتبار سے کہ اگر یہ حکم نہ ہوتا تو دیگر احکام نامکمل ہوتے، ان تمام (احکام) کا کمال اس سے وابستہ ہے

- یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ روحِ دین ولایت و امامت ہے۔ اگر انسان کے پاس ولایت و امامت نہ ہو، تو

اسکے اعمال کی حیثیت ایک بے روح جسم کی سی ہوگی۔

اب ہم اُس جملے کی طرف تے ہیں جس کے بارے میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسکی وضاحت کریں گے۔

فرمایا: اَلْيَوْمَ يَبْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اَخْشَوْنَ۔ ج کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں۔

اُن کی طرف سے فکرمند نہ ہونا اور اُن سے نہ ڈرنا، میری طرف سے فکرمند ہونا اور مجھ سے ڈرنا۔

## مشیتِ الہی کی کیفیت

اولاً قرنِ کریم کا ایک کلی اصول ہے 'اور وہ یہ کہ وہ کہتا ہے کہ ہر چیز مشیتِ الہی سے ہے۔ دنیا میں کوئی چیز مشیتِ الہی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتی: **وَلَا رَظْطٌ وَلَا يَابِسٌ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ** (سورہ انعام۔یت ۵۹) اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا مشیتِ الہی کوئی حقیقت ہے 'یا پھر ویسے ہی بغیر کسی حساب کتاب کے 'قرعہ اندازی کی طرح ایک چیز یہاں سے اور ایک چیز وہاں سے چن لینا ہے؟ دوسری بات اسکی وضاحت کرتی ہیں کہ مشیتِ الہی کائنات میں ایک سنت 'قانون اور حساب رکھتی ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟

قرن کی دو بات میں 'ان بات میں پائے جانے والے ایک باریک سے فرق کے ساتھ 'اس طرح ارشاد ہوتا ہے: **"إِنَّ أَلَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ"** (سورہ ردۃ ۱۳۔یت ۱۱) خدا کسی قوم

کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے پ کو تبدیل نہ کر لے۔ اللہ کسی قوم کو جو نعمت عطا فرماتا ہے 'وہ اس وقت تک اس سے واپس نہیں لیتا جب تک وہ قوم خود اپنے پ کو تبدیل نہیں کر لیتی۔ یعنی جب وہ اس ن

عمت کے لئے اپنی قابلیت اور صلاحیت کو گنوا دیتی ہے 'تب اللہ اس سے اپنی نعمت سلب کر لیتا ہے۔ یعنی یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہر کام مشیتِ الہی سے ہوتا ہے 'تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی چیز کے لئے کوئی شرط نہیں ہوتی۔ ہر چیز ہماری مشیت سے ہے۔ ہم نے دنیا کے لئے ایک قانون اور قاعدہ رکھا ہے۔ سبب اور مسبب قرار دیا ہے 'شرط اور مشروط مقرر کئے ہیں۔ نعمتیں 'جن میں **"وَأَتَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي"** بھی شامل ہے (بغیر کسی قاعدے قانون کے نہیں ہیں)۔ اے مسلمانو! میں نے تمہارے لئے اپنی نعمت تمام کردی ہے اور تمہیں اپنی نعمت عطا کردی ہے۔ یہ نعمت تمہارے پاس پائیدار اور مستحکم ہے یا نہیں؟ نقصان پذیر ہے یا نہیں؟ قرن جواب دیتا ہے: **الْيَوْمَ يَنْسُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ** 'خارجی اور بیرونی طرف سے 'اُس دشمن کی طرف سے جو دشمن کی صورت میں ہے اور کافر ہے 'اب اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا' اُن کی طرف سے کوئی خوف اور فکرمندی نہیں ہے۔

پھر فکر مندی کس کی طرف سے ہے؟

میری طرف سے۔

میری طرف سے کیا مراد ہے؟

میری مشیت کی طرف سے۔

میری مشیت کی طرف سے کیسے؟

میں نے تم سے کہا ہے کہ میں کوئی نعمت اُس وقت تک لوگوں سے سلب نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود نہ بدل جائیں اور اپنے پ کو متغیر نہ کر لیں۔ پس اے مسلمانو! اب جو ضرر بھی اسلامی معاشرے کو پہنچے گا وہ اندر سے پہنچے گا' باہر سے نہیں۔ باہر والے اندر کی مدد سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ دنیائے اسلام نے جو نقصان بھی اٹھایا ہے 'یا ہمارے زمانے تک اٹھا رہی ہے 'وہ خود اسکے اندر سے ہے۔ یہ نہ کہئے گا کہ باہر بھی دشمن موجود ہے۔ میں بھی مانتا ہوں کہ باہر دشمن ہے 'لیکن باہر کا دشمن باہر سے کچھ نہیں کر سکتا۔ باہر کا دشمن بھی اندر سے کام کرتا ہے۔ (لہذا) مجھ سے ڈرو کہ کہیں تمہارا

اخلاق‘ روح‘ روحانی خصوصیات‘ ملکات اور اعمال بدل نہ جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا‘ تو میں اپنی اُس سنت کی بنا پر کہ جو لوگ اپنی قابلیت اور صلاحیت گنوا دیتے ہیں میں اُن سے نعمت سلب کر لیتا ہوں‘ تم سے بھی یہ نعمت واپس لے لوں گا۔

## پیغمبر اسلام کی دو حدیثیں

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ ولہ وسلم نے فرمایا:

”اِنِّی لَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِی الْفَقْرَ وَلٰکِنْ اَخَافُ عَلَیْهِمْ سَوِّیَ التَّدْبِیْرِ۔“

مجھے اپنی امت کے بارے میں اقتصادی فقر اور غربت کا ڈر نہیں ہے۔ فقر میری امت کو تباہ نہیں کرے گا۔ میں اپنی امت کے بارے میں کج فکری‘ بدفکری‘ بداندیشی اور جہالت و نادانی سے خوفزدہ ہوں۔ اگر مسلمان بصیرت‘ دور اندیشی‘ مستقبل بینی‘ گہری نظر اور گہری فکر سے محروم ہو کر ظاہر بین اور سطحی ہو گئے‘ تو یہ وہ وقت ہوگا جب اسلام کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

خوارج کون تھے؟ یہ ظاہر بین لوگ تھے‘ جو گہرائی میں نہیں دیکھتے تھے، کوتاہ نظر تھے لیکن تھے اطاعت گزار‘ دیندار‘ راسخ العقیدہ اور عابد و زاہد۔ حضرت علیؑ انہیں ریاکار نہیں سمجھتے تھے۔ پؑ نے اُن پر بہت تنقید کی ہے لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ اپنی عبادت میں ریاکار تھے۔ فرماتے تھے کہ وہ کج فہم اور کج فکر ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ ولہ وسلم کی دوسری حدیث‘ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے اُس فرمان میں نقل کی ہے جو پؑ نے محمد ابن ابوبکر کے نام لکھا تھا اور جو نہج البلاغہ میں موجود ہے۔ محمد ابن ابوبکر‘ حضرت ابوبکر کے بیٹے ہیں۔ ان کی والدہ اسماء بنتِ عمیس ہیں۔ وہ حضرت ابوبکر سے پہلے جعفر ابن ابی طالب کی زوجہ تھیں۔ ان سے ان کے بیٹے عبداللہ بن جعفر تھے۔ بعد ازاں حضرت ابوبکر نے ان سے شادی کر لی اور ان سے محمد ابن ابوبکر دنیا میں آئے۔ وہ بہت پاکیزہ ہستی تھے۔ حضرت ابوبکر کے بعد اسماء سے امیرالمومنین (علیؑ) نے شادی کر لی۔ محمد امیر المومنین کے ربیب‘ یعنی امیرالمومنین کی زوجہ کے بیٹے ہو گئے۔ کیونکہ وہ بہت چھوٹے تھے اور حضرت ابوبکر کی وفات کے وقت شاید دو سال کے تھے‘ لہذا حضرت علیؑ کے گھر میں پلے بڑھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ: مُحَمَّدٌ ۛ اِبْنِیْ مِنْ صَلْبِ اَبِیْ بَكْرٍ (محمد میرا بیٹا ہے‘ اگرچہ ابوبکر کے صلب سے ہے) بہر حال وہ بہت صالح‘ متقی اور پاکیزہ شخص تھے اور حضرت علیؑ کے ساتھ رہتے ہوئے شہید ہوئے۔ حضرت علیؑ نے انہیں مالکِ اشتر سے پہلے مصر کی حکومت کے لئے مقرر کیا تھا اور وہ وہیں شہید ہوئے۔ جو فرمان پؑ نے اُن کے نام جاری کیا اُس کے خرمیں فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولہ وسلم سے سنا ہے کہ:

”میں اپنی امت کے بارے میں نہ مومن سے ڈرتا ہوں اور نہ مشرک سے۔ کیونکہ مومن کو اُس کے ایمان کی وجہ سے (گمراہ ہونے سے) بچائے رکھے گا۔“

(یہ نہ کہئے گا کہ پس خوارج بھی تو مومن تھے۔ جو ایمان بصیرت کے بغیر ہو‘ اسلام اسے حقیقی ایمان نہیں سمجھتا۔ وہ عبادت گزار تھے لیکن اسلام جیسا مومن چاہتا ہے کہ ”الْمُؤْمِنُ کَیْسُ فِطْنٍ“ ویسے نہ تھے)۔ مومن کو خدا اس کے ایمان کے سبب محفوظ رکھتا ہے‘ بچا لیتا ہے۔ یعنی اُس کا ایمان اُسے محفوظ رکھنے اور بچانے والا ہے۔ پس مومن کی طرف سے کوئی مشکل نہیں ہے۔

رہا مشرک و کافر‘ وہ جس کے ظاہر و باطن سے کفر چھلکتا ہے، اللہ اس کے شرک کی وجہ سے اس کا قلع قمع کر دیتا ہے۔



آیت ”الْيَوْمَ يَنْسَأُ الْذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ“ کا یہی مفہوم ہے۔

”وَلِكِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ كُلَّ مُنَافِقٍ الْجَنَانِ عَالِمِ اللِّسَانِ يَقُولُ مَا تَعْرِفُونَ وَ يَفْعَلُ مَا تُنْكِرُونَ۔“

مگر مجھے جن کی طرف سے خوف اور فکر مندی ہے، وہ منافق اور دو رخے لوگ ہیں۔ جن کی زبان اور ظاہر کا رخ ایک طرف ہے اور قلب و باطن کا رخ دوسری طرف۔ دینداری کا اظہار کرنے والے بے دین افراد۔ عَالِمِ اللِّسَانِ جن کی زبان عالم ہے جو اپنی زبان سے مومن و مسلمان ہیں۔ کیونکہ عالم ہیں اس لئے اُن کی زبان خوب چلتی ہے۔ لیکن اُن کا دل نفاق سے بھرا ہوا ہے۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں: يَقُولُ مَا تَعْرِفُونَ وَ يَفْعَلُ مَا تُنْكِرُونَ ۔ بات ایسی کرتے ہیں جس سے پ مانوس و شنا ہوں اور جسے پ جانتے ہوں۔ بات تو اچھی کرتے ہیں عمدہ اور بلند۔ جب بات کرتے ہیں توپ ان کے فلسفے کے شیفتہ ہوجاتے ہیں، واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ (کہتے ہیں) واقعاً مسلمانوں میں ایسے فرد پر افتخار کرنا چاہئے۔ لیکن اگر اس دمی کے عمل کو گہری نظر سے دیکھیں گے تو اُسے اس چیز کے برخلاف پائیں گے جسے پ پہچانتے ہیں۔ یعنی بالکل الٹ اور سب ”منکر“۔ اس کا قول تو ”معروف“ ہوتا ہے لیکن عمل ”منکر“۔

اس بنیاد پر جب ہم دیکھتے ہیں، تونظر تا ہے کہ رسول اکرمؐ دو گروہوں کی طرف سے فکر مند اور خائف ہیں۔ ایک عالم و زیرک لیکن منافق افراد کا گروہ جو ظاہراً مسلمان ہیں اور باطناً کافر اور دوسرا عبادت گزار لیکن بے بصیرت و جاہل مسلمانوں کا گروہ۔

### ایک دوسری حدیث

رسول اللہ صلی اللہ علیہ ولہ وسلم کی ایک اور حدیث ہے۔ پ نے فرمایا:

”قَصَمَ ظَهْرِي رَجُلَانِ: عَالِمٌ مُتَّهَتٌ وَ جَاهٌ لَمُتَنَسَكٌ۔“

یہ حدیث بھی انہی دو احادیث کا مفہوم بیان کر رہی ہے۔ فرماتے ہیں: دو طرح کے دمیونے میری کمر توڑ ڈالی ہے۔

### رسول اللہ کی کمر توڑ ڈالنے سے کیا مراد ہے؟

ایک شخص گناہگار ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اسکے گناہ کا بُرا اثر صرف اُسی تک محدود رہتا ہے، لیکن کبھی ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کا انحراف پیغمبر کے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔

یہ ہے وہ بات۔ یعنی یہ دو گروہ اسلام کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ یہ لوگ نہ فقط خود عاصی، گناہگار، بدبخت، شقی اور جہنمی ہیں بلکہ اسلام کے لئے بھی سدِ راہ اور دوسرے مسلمانوں کی گمراہی کا بھی سبب ہیں۔ (یہ لوگ کون ہیں؟) ایک راز فاش کرنے والا عالم اور دوسرا پرہیز گار اور عبادت گزار جاہل۔ یہ بھی وہی مضمون ہے۔

اسلامی معاشرے کو داخلی خطرہ درپیش ہے ان سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے درجے پر قرن اور اس کے بعد رسول اکرمؐ کی احادیث، مسلسل ہم سے کہتی ہیں کہ اسلامی معاشرے کو اپنے اندر سے خطرہ درپیش ہے۔ ایک منافق زیرک اقلیت اور ایک جاہل سادہ لوح لیکن دیندار اکثریت۔ اگر یہ جاہل نہ ہوں تو وہ زیرک کچھ نہیں کرسکتے اور اگر وہ زیرک نہ ہوں تو کوئی ان جاہلوں کو ٹیڑھے راستے پر نہیں لے جائے گا۔

## امیر المومنین علی علیہ السلام کی مشکلات

یہیں سے سمجھ سکتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی مشکلات کتنی زیادہ تھیں۔ پؑ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ تنزیل پر جنگ کرتے رہے اور میں تاویل پر۔ واقعاً رسول اللہ کا کام علیؑ کے کام کی نسبت سان تھا۔

### رسول اللہ کے مدِ مقابل کون لوگ تھے؟

کفارؑ وہ لوگ جو کافر تھے اور جنہونے اپنے کفر کو کسی پردے میں نہیں چھپا رکھا تھا۔ ابو سفیان رسول اکرمؐ کے مدِ مقابل تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کفرؑ یعنی کھلا کفرؑ وہ کفر جس کے چہرے پر نقاب نہ ہوؑ اسلام کے مدِ مقابل یاؑ اُس نے اسلام سے شکست کھائی، لیکن جب کفر اسلام کا لباس پہن لیتا ہےؑ تب خطرناک ہوجاتا ہے۔

ابو سفیان جیسے لوگ دن بدن کمزور ہورہے تھے۔ اور (خر کار) ختم ہو گئے۔ لیکن علیؑ کے مدِ مقابل معاویہ تھا۔ جس کی ماہیت ابوسفیان کی ہی ماہیت ہےؑ فرق یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کا لباس پہن رکھا ہے۔ جو لوگ معاویہ کے سامنے تے ہی محسوس نہیں کرتے کہ وہ اب بھی ہبل بت کے خلاف ہی جنگ زماہیں۔

وہ ہستی جس کا بقول امیر المومنینؑ (اور جسے ج تاریخ نے بھی سو فیصد درست ثابت کر دیا ہے) حضرت عثمان کے قتل میں سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ حضرت عثمان کے قتل کے اسباب خود معاویہ اور امویوں نے فراہم کئے تھے۔ تاکہ اس قتل سے فائدہ اٹھا سکیں۔ (حضرت عثمان خود بنی امیہ سے تعلق رکھتے تھے) ان لوگوں نے سوچا کہ ابھی تک وہ زندہ عثمان سے فائدہ اٹھا رہے ہیںؑ اب موقع گیا ہے کہ حضرت عثمان کی لاش سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کی ناراضگی کے اسباب فراہم کریں تاکہ لوگ مل کر حضرت عثمان کو قتل کردیں۔ حضرت عثمان نے معاویہ سے مدد طلب کی۔ معاویہ نے لشکر بھیجا لیکن اسے حکم دیا کہ مدینہ کے پاس فلاں جگہ پر ٹھہر جانا اور مدینہ میں داخل نہ ہونا۔ اگر تم خود اپنی نکھوں سے بھی حضرت عثمان کو قتل ہوتے دیکھوؑ تب بھی جب تک میں حکم نہ دوں کوئی قدم نہ اٹھانا۔ انہونے خاص طور پہ یہ کہا کہ: کہیں اپنے جذبات کے زیر اثر نہ جاناؑ دیکھنا کہ میرا حکم کیا ہے۔ انہونے اپنے کارندوں کو حضرت عثمان کے گھر کے اندر بھیجا اور حکم دیا کہ جونہی عثمان قتل ہوںؑ اُن کی قمیض اور ہر وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جاسکےؑ اٹھا کر لے نا۔ حضرت عثمان کی قمیض کا معاویہ کے ہاتھ میں ہونا حادثاتی اور اتفاقی معاملہ نہ تھا۔ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔

حضرت عثمان کی نائلہ نامی ایک بیوی نے حضرت عثمان کو اچھی نصیحتیں کی تھیں کہ پؑ علیؑ کی بات سنیںؑ انہیں اپنا دشمن نہ سمجھیںؑ وہ پؑ کی اور مسلمانوں کی بھلائی کی بات کرتے ہیںؑ مروان کی بات نہ سنیں۔ لیکن وہ مروان کی بات سنا کرتے تھے۔ جب لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کرنا چاہا تو نائلہ خاتون نے اپنے پؑ کو حضرت عثمان کے اوپر گرا دیاؑ تاکہ انہیں بچا سکیں۔ لیکن اس خاتون کی ایک انگلی بھی کٹ گئی جو معاویہ کے پاس لے جائی گئی۔ بعد ازاں معاویہ نے اس قمیض کو اپنے منبر کے ساتھ ویزاں کر دیا۔ اس کٹی ہوئی انگلی کو بھی انہونے لٹکا دیا اور پھر ہائے ہائے کر کے رونا شروع کر دیا کہ مظلوم خلیفہ قتل ہو گئے۔ **ایہا الناس! انتقام انتقامؑ وَ مَنْ قَتَلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لَوَلِيِّهِ سُلْطٰناً۔**

اب جہالت بھی مدد کرتی ہے۔ کسی ایک نے بھی یہ نہ پوچھا کہ قرن تو کہتا ہے کہ جب کوئی مظلوم مار اجائےؑ تو ہم اس کے وارث کو اختیار دیتے ہیں کہ اُسے اور اس کے خون کا مطالبہ کرےؑ تم کون ہوتے ہو؟ تم تو خونِ عثمان



کے ولی نہیں ہو!!

## حضرت علی کے اکابر اصحاب کا تردد اب علی کی جنگ کس سے ہوگی؟

ایسے شخص سے جو مسلسل اسلام کا دم بھرتا ہے۔ یہی وہ صورتحال ہے جس نے حضرت علیؑ کے کام کو مشکل بنا دیا ہے۔ امیر المومنین کے اکابر اصحاب کو ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے میں شک و تردد تھا۔ ربیع بن خثیمؓ یہی خواجہ ربیع جن کا مقبرہ مشہد میں ہے اور جس کی لوگ زیارت کو جاتے ہیں، یہ زاہدوں، عابدوں اور امیر المومنینؑ کے شیعوں میں سے تھے۔ البتہ ایک کم بصیرت شیعہ۔ یہ بڑے عبادت گزار تھے لیکن کم بصیرت تھے۔ یہ چند افراد کے ہمراہ امیر المومنین کے پاس تے ہیں اور کہتے ہیں: یا امیر المومنین! حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ان سے جنگ کرنے میں شک ہے۔ دوسری طرف ہم پ سے جدا بھی نہیں ہونا چاہتے۔ پ ان سے جنگ کرنے کے سوا ہمارے ذمے کوئی اور کام کر دیں۔ امیر المومنین نے انہیں ایک سرحد پر ذمے داری سونپ دی۔ کہنے لگے: ہاں یہ بہت اچھا ہے، وہاں ہم کافروں سے جنگ کریں گے۔ اب ہم مطمئن ہیں۔ لیکن یہاں مسلمانوں سے جنگ کرنے میں ہمیں شک ہے اور ہمارے دل میں وسوسہ ہے۔ ربیع بن خثیم جیسا دمی ایسی بات کہتا ہے۔ البتہ انہی کے درمیان ایسے لوگ بھی تھے جن کی بصیرت کامل تھی۔ ان میں سب سے نمایاں عمار بن یاسرؓ تھے۔ عمار جنگ کرتے جاتے اور کہتے جاتے کہ کل ہم نے تنزیل قرن پر جنگ کی اور ج ہم تاویل قرن پر جنگ کر رہے ہیں۔ جب معاویہ کا پرچم قرن کے ظاہری نعروں کے ساتھ بلند ہوا تو عمار نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ ان پرچموں اور اُن پرچموں میں کوئی فرق نہیں جن کے خلاف ہم بدر و احد میں جنگ کرتے رہے ہیں۔ عمار سپاہ امیر المومنین میں ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتے تھے۔ عمار شہید ہوئے تو ایک بڑی تعداد کو یقین گیا۔ کیونکہ عمار ایک ایسے دمی تھے جن کے بارے میں سب ہی ایک روایت جانتے تھے اور یہ روایت سب اصحاب رسولؐ تابعین اور اہل کوفہ و شام میں متواتر تھی۔

جس دن مسجد نبوی کی تعمیر ہو رہی تھی اور رسول اکرمؐ نئے نئے مدینہ میں ئے تھے اور عمار بھی حال ہی میں مکہ سے وہاں پہنچے تھے۔ عمار کے اندر جو شوق، ولولہ اور ایمان تھا، اسکی وجہ سے وہ مسجد کی دیواریں بلند کرنے کے لئے دوسروں سے دوگنا زیادہ پتھر اٹھاتے تھے، پسینہ بہہ رہا تھا، خستہ حال تھے اور اس حال میں نعرے بلند کرتے، شعر پڑھتے اور (پتھر اٹھاتے) رہے تھے۔ رسول اکرمؐ نے اُن کی طرف نگاہ اٹھائی، مسکرائے اور فرمایا:

”تم خوش قسمت ہو اے عمار! تمہیں ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔“

یہ قرن مجید کی اس یت کی طرف اشارہ ہے کہ:

”اور اگر مومنین کے دو گروہ پس میں جھگڑا کریں تو تم سب ان کے درمیان صلح کراؤ، اس کے بعد اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے تو سب مل کر اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرنے والا گروہ ہے، یہاں تک کہ وہ بھی حکم خدا کی طرف واپس جائے۔“ (سورہ حجرات۔ یت ۹)

مطلب یہ ہے کہ رسول اکرمؐ خبر دے رہے تھے کہ مستقبل میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین جنگ ہوگی۔ ان میں سے ایک گروہ سرکش و باغی ہوگا۔ لہذا اس سرکش گروہ کے خلاف اس دوسرے گروہ کی حمایت کی جائے۔ جب عمار قتل ہوئے، تو جن لوگوں کو شک تھا وہ کہنے لگے کہ ج ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ علیؑ حق پر ہیں اور معاویہ باطل پر۔ ہاشم بن عتبہ بن مرقال ان لوگوں میں سے ایک تھے جنہیں عمار کی شہادت کے بعد دیکھا گیا کہ وہ اب شدت کے ساتھ حملے کر رہے ہیں یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے۔

پس دیکھئے کہ حضرت علیؑ کا کام کس قدر مشکل تھا۔ علیؑ کے مدِ مقابل جو لوگ تھے ان میں سے اکثریت جاہل و نادان لوگوں کی تھی اور ایک اقلیت منافقوں اور دو رُخے لوگوں کی تھی۔

## نتیجہ

اب ہم اپنی معروضات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ وہ یت جو واقعے اور حدیثِ غدیر کے حوالے سے نازل ہوئی، اس کے مذکورہ جملے اور رسولِ اکرمؐ کی فرمائی گئی احادیث سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ اس زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا ہے یا پہنچتا ہے وہ اسی طرح پہنچتا ہے۔ پ اس وقت دیکھیں کہ مسلمانوں کو فلسطین میں جو نقصان پہنچ رہا ہے، اس میں جس قدر مسلمانوں کا ہاتھ ہے وہ زیادہ ہے یا اسرائیل کا جو بیرونی دشمن ہے۔ اس وقت بے وطن چھاپہ ماروں کو اردنی سپاہیوں سے زیادہ خطرہ ہے یا اسرائیلی سپاہیوں سے؟ ہمیشہ یونہی رہا ہے اور ج بھی ایسا ہی ہے۔ ہم عرض کرچکے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے خوشی اور مسرت کا باعث ہے، وہ یہ ہے کہ ہمارے جوان طبقے میں ہمارے روشن فکر اور روشن بین طبقے میں اور ہمارے طلباء کے طبقے میں ایک دینی تحریک پیدا ہو گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ لوگ بصیرت اور دین کو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا رکھیں گے اور اسے معاشرے کو سونپیں گے۔ تاکہ ہم پھر اپنی اصلی عزت و شوکت کی طرف لوٹ جائیں۔ ہم مسلمان ہوں، کامل مسلمان، بابصیرت مسلمان۔ شیعہ ہوں لیکن حقیقی شیعہ، علی کو پہچاننے والے شیعہ، ایسے شیعہ جو علی کی معرفت بھی رکھتے ہوں اور علی کے پیروکار بھی ہوں۔